ردِ تشکیل: تعارف و تفہیم

عبدالعزیز ملک *

Abstract:

Deconstruction is always a double movement of simultaneous affirmation and undoing. It started out as a way of reading the history of metaphysics in Heidegger and Jacques Derrida, but was soon applied to the interpretation of literary, religious, and legal texts as well as philosophical ones, and was adopted by several French feminist theorists as a way of making clearer the deep male bias embedded in the European intellectual tradition. In this article effort is made to understand and analyse the Deconstruction.

کلیدی الفاظ: پس ساختیات۔ردِ تشکیل۔افتراق و التوا۔کثیر المعنویت۔وحدتِ معنی۔ژاک دریدا پس ساختیاتی تنقید کا ایک معتبر نام ہے، جو "ردِ تشکیل" کے فلسفے سے علمی دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔اس نے اس تصور کو ہدفِ تنقید بنایا کہ انسای فکر سماجی و ثقافتی تشکیل ہے جو زمان و مکان کے تغیرات کے تحت تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہتی ہے، جس طرح دیگر تغیرپذیر اشیاء کا تاریخی تجزیہ کیا جا سکتا ہے وہیں انسانی فکر و نظر کو بھی تاریخی تجزیے کی ذیل میں لا کر معرضِ تفہیم میں لایا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انسانی فکر و نظر کو سماجی تشکیل قرار دینے کا رواج علوم کی تقریباً تمام شاخوں میں موجود تھا۔اس کی مثال بشریات میں کلاڈ لیوی سٹراس کے اس تصور میں ملتی ہے جب وہ تمام اساطیر کی بنت کے عقب میں مہا اسطور کی نشان دہی کرتا ہے۔ نفسیات میں سگمنڈ فرائیڈ اور کارل گستاؤ ژونگ انسانی لاشعور کو موضوعِ بحث بناتے ہیں، لسانیات میں فرڈی ناں سوسئیر لسانی ساخت اور سماجیات میں درخیم Social Millieu کی بات کرتا ہے۔ لیکن جس طرح کی ساخت کی نشان دہی مذکورہ مفکرین نے اپنے اپنے نظامِ فکر میں کی ہے، اختیات اور پس ساختیات میں اس کا تصور اس سے مختلف ہے، کیوں کہ پس ساختیاتی مفکرین نے اپنے نظامِ فکر کی

---

* عبدالعزیز ملک، لیکچرار اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

بنیاد سوسئیر کے تصورِ ساخت پر استوار کی ہے اور سوسئیر کا تصورِ ساخت مذکورہ مفکرین کے تصورِ ساخت سے مختلف ہے۔ پس ساختیاتی فکر میں نومارکسی تنقید، تانیثیت، نئی نفسیاتی تنقید، نوتاریخیت اور بین المتونیت کے دبستان شامل ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہمیت ساخت شکنی یا ردِ تشکیل کو حاصل ہے جو ژاک دریدا سے منسوب ہے۔

ردِ تشکیلی طریقہ کار کا آغاز سب سے پہلے فرانس کے Tel Quel گروپ نے کیا تھا، لیکن اس کو فلسفیانہ بنیادوں پر استوار کرنے کا کام ژاک دریدا نے کیا اور اسے شہرت امریکہ سے حاصل ہوئی۔ امریکہ کی Yale یونیورسٹی میں جیفری ہارٹ مین، جے ہلس ملر اور ہیرولڈ بلوم ایسے ادبی ناقدین کا ایک ایسا گروہ تھا جو فن پارے کی بند تعبیر و توضیح کے حق میں نہ تھا، بلکہ معنی کی جہات کو کھلا رکھنے کا قائل تھا۔ اس گروہ سے منسلک ناقدین کو اس بات کا ادراک تھا کہ زبان کا علامتی نظام معنی کو پیدا بھی کرتا ہے اور اس کا استرداد بھی کرتا ہے۔ مگر ردِ تشکیل کو علمی و ادبی حلقوں میں ژاک دریدا کے حوالے سے ہی شہرت حاصل ہوئی۔ ژاک دریدا کا مذکورہ فلسفہ اس کی تین کتب میں ایک ساتھ سامنے آیا۔ یہ کتب ۱۹۶۷ء میں فرانس سے بیک وقت شائع ہوئیں، جن میں اس نے مغربی فلسفے کے بنیادی مفروضات کو سوال زد کیا۔ ان کتب کے انگریزی نام یہ ہیں۔

1. Gramatology Of
2. Writing and Difference
3. Speech and Phenomena,

ان کتب کی اشاعت سے علمی و ادبی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور دریدا کی فکر عصرِ حاضر کے مفکرین کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان کتب کی اشاعت سے دریدا کا شمار بیسویں صدی کے اہم فلسفیوں میں ہونے لگا۔ اس کا مطالعہ خاصا وسیع تھا اور وہ خود کو محض فلسفے کے مطالعے تک محدود بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دریدا مابعد الطبعیاتی فکر کی پوری روایت پر نظر رکھتا ہے جس کا سلسلہ روسو اور ڈیکارٹ سے جا ملتا ہے۔ کثرتِ مطالعے کے باعث وہ گہرے سیاسی و سماجی شعور سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ متنوع علوم کے مطالعے اور اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کے باعث دریدا کے ناقدین کے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی تحریروں کو فلسفے کی ذیل میں رکھا جائے یا متن کی تنقید کی ذیل میں رکھا جائے۔

دریدا کی فکر پر مظہریاتی فلسفی ایڈمنڈ ہسرل اور وجودی فلسفی مارٹن ہائیڈ گر کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ان دونوں شخصیات کا شاگرد ہے۔ اس کے باجود ہسرل کے فکری مغالطوں پر اس کی گہری نظر ہے۔ ذہن میں رہے کہ اپنی کتب کی اشاعت سے قبل وہ ہسرل کی کتاب Origin Of Geometry پر مفصل

مقدمہ تحریر کر چکا تھا۔اس کے علاوہ اس نے ہسرل پر تین بنیادی کتابیں بھی تحریر کیں ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ردِ تشکیل پر بیسویں صدی کی سائنسی فکر کے اثرات کو بھی تلاش کیا ہے جس کا ذکر ان کی کتاب "معنی اور تناظر" میں شامل مضمون "ساخت شکنی" میں موجود ہے۔

۱۹۶۶ء میں ہوپ کنس یونیورسٹی میں "ہیومن سائنس" کے موضوع پر سیمینار منعقد ہوا۔اس سیمینار میں ژاک دریدا نے Structure, Sign and Play-in the discourse of the Human Sciences کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔یہی مقالہ آگے چل کر ردِ تشکیل کی بنیاد بنا۔اس کے بعد اس موضوع پر بحث و مباحثے کا سلسلہ چل نکلا جو آج بھی جاری ہے۔دریدا کے بعد ردِ تشکیل سے متعلق نئی نئی اصطلاحات اور نظریات سامنے آئے۔مثلاً ڈی مان نے اپنی تصنیف "الیگری (Allegory)" میں تحریر کیا کہ نقاد ایک طرح کی بے بصری کے ذریعے بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ہیڈن وائٹ نے تاریخ نگاروں کی تحریروں کو رد کیا۔اس کے علاوہ Readers Oriented Theories نے مطالعے کے عمل کو قاری کے شعور سے منسلک کیا۔رامن سیلڈن، رولاں بارتھ اور جانتھن کلر نے بھی اس ضمن میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔نسوانی تنقید کا ظہور بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں نسوانی نقادوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان طریقوں کو ڈی کنسٹرکٹ کیا جائے جن پر مرد کا غلبہ ہے۔اس حوالے سے روزالینڈ جونز(Rosalind Jones) کا نام قابلِ ذکر ہے جس نے دریدا کے تصور "ردِ تشکیل" کو مرد مرکزیت کے خاتمے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ساخت شکنی یا ردِ تشکیل کیا ہے؟اس حوالے سے بحث کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ اپنی کتاب "ساختیات ،پس ساختیات اور مشرقی شعریات" میں ردِ تشکیل کی تعریف کا تعین یوں کرتا ہے:

> "ردِ تشکیل(Deconstruction) سے مراد متن(Text) کے مطالعے کا وہ
> طریقہ کار ہے جس کے ذریعے نہ صرف متن کے متعینہ معنی کو بے دخل (Undo)
> کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کی معنیاتی وحدت کو پارہ پارہ بھی کیا جاسکتا ہے۔"(۱)

ردِ تشکیل سوسئیر کے تصورات کو بنیاد بناتے ہوئے اس سے معکوس روش اپناتی ہے اور پھر اس سے بھی انحراف کر لیتی ہے اور ان تمام فلسفیانہ بنیادوں کو گرا دیتی ہے جس پر اس نے خود اپنی عمارت تعمیر کی ہوتی ہے۔یہ ایک بُت شکن رویے کا دوسرا نام ہے۔یہ کسی اصول اور مفروضہ کی قائل نہیں ہے۔ردِ تشکیل کے مفکرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر ادبی متن میں خود کو رد کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے۔ایک نیا گھر نئے فیشن کے مطابق بنایا جاتا

ہے، لیکن اس میں مستقبل کے فیشن کے ڈیزائن بھی مخفی ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فنِ تعمیر گارے اور سیمنٹ سے آگے ترقی نہ کر سکتا۔ R.Gnanasekaran نے اپنے ایک مضمون میں ردِ تشکیل کو یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے:

> The word deconstruction is gotten from the French verb "deconstuire," connoting to undo the improvement of or the development of, to take to pieces. Deconstruction is a system that incorporates all other related necessities of building radially and tenaciously, and/ or contains both obliteration and improvement in itself giving space for the illumination that there is no destruction without advancement and the other way around.(۲)

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ردِ تشکیل سوسئیر کی لسانی ساخت پر اپنی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ جس طرح لانگ کے بغیر جملے تخلیق نہیں کیے جا سکتے اور نہ ہی معنی کی ترسیل کو ممکن بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح فن کے پسِ پشت بھی ایک ایسا ہی نظام موجود ہوتا ہے جس کے عمل پیرا ہونے سے معنی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس نظام کے مطالعے پر ساختیاتی ناقدین نے زور دیا اور کہا کہ اس کی دریافت سے معنیاتی نظام کو معرضِ تفہیم میں لایا جا سکتا ہے۔ مگر ردِ تشکیل میں ایسا نہیں ہے یہ ایک شدید باغیانہ رویے کا نام ہے۔ اس کے طریقہ کار کو منظم نظام کے طور پر پیش کرنا، ایک فاش غلطی کے ارتکاب کے مترادف ہے۔ ردِ تشکیل ساختیات کو ہدفِ تنقید بناتی ہے کیوں کہ اس نے ان سچائیوں اور بصیرتوں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا جن کو بے دخل کر کے وہ آگے بڑھی تھی۔ بغاوت جب امکانات کو حرفِ آخر سمجھ لے تو سکہ بند ہو جاتی ہے۔ دریدا نے اپنی تحریروں میں ساخت کے تصور کو محدود کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ردِ تشکیل اس مفروضے کو بھی ماننے سے ہچکچاہٹ کا شکار ہے کہ معنی کی ساختیں انسانی ذہن کے داخلی نظام سے مشابہت رکھتی ہیں جو ادراک کے عمل میں موجود ہیں۔ ردِ تشکیل کی ساختیات پر تنقید کے حوالے سے ناصر عباس نیر اپنی کتاب "جدید اور مابعد جدید تنقید" میں تحریر کرتے ہیں:

"ساخت شکنی نے پہلا وار ہی اس ساختیاتی تصور۔۔۔کہ کسی (لسانی) نظام کا منضبط علم ممکن ہے۔۔پر کیا، اور یہ دلیل ثابت کیا کہ کسی ڈسکورس میں کوئی سسٹم سرے سے موجود ہی نہیں، لہٰذا اس کے منضبط علم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دریدا نے اپنے استدلال کے لیے خود سوسئیر کے لسانی نظام کے تصور کو بنیاد بنایا۔ سوسئیر نے نشان کی بابت ایک نکتہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ ایک نشان کا دوسرے نشان سے رشتہ فرق کا ہے۔ قلم اس لیے قلم ہے کہ یہ بلم، علم یا الم نہیں ہے۔ سوسئیر نے نشان کی اس خصوصیت کو منفی قرار دیا تھا"۔(۳)

سوسئیر کے ساختیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو زبان نشانات کا نظام ہے اور سوسئیر کہتا ہے کہ نشان اپنے آپ میں منفی حیثیت کا حامل ہے، یوں منطقی طور پر منفی ہونا زبان کی خصوصیت ہے لیکن نشانات کا یہ نظام جب عمل آراء ہوتا ہے تو مثبت حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ سوسئیر نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ دریدا زبان میں مثبت عنصر کا انکاری ہے اور خیال ظاہر کرتا ہے کہ زبان میں افتراق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تمام نشانات اپنی معنیاتی شناخت کے لیے دیگر نشانات پر انحصار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ساختیات میں سوسئیر نے کہا ہے کہ ہر معنی نما کا ایک معنی ہوتا ہے اور اس معنی کی توضیح کے لیے کسی نئے معنی نما کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے اس کا اپنا معنی جُڑا ہوتا ہے۔ ردِ تشکیل کے حوالے سے اس کو دیکھا جائے تو معنی خیزی کا یہ عمل مسلسل آگے سے آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے۔ مسلسل التواء کا یہ عمل ایک ایسے گورکھ دھندے میں بدل جاتا ہے کہ قاری کسی حتمی معنی تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ معنی خیزی کا مذکورہ عمل افتراق کی بنیاد پر ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ دریدا کے اس ردِ تشکیلی تصور میں کسی بھی لسانی نظام کا مربوط علم ممکن ہی نہیں۔

دریدا نے اپنی تحریروں میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ مغربی مابعدالطبعیات کے جتنے بھی تصورات ہیں وہ لفظ کے معنی کی موجودگی پر قائم ہیں اور لفظ کے معنی کی موجودگی پر اس لیے قائم ہیں کہ وہ 'صوت مرکزیت' پر مبنی ہیں۔ مغرب میں یہ سلسلہ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر تک چلا آ رہا ہے۔ اس تصور کے تحت یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ لفظ بغیر کسی رکاوٹ کے فرد کے ذہن میں موجود معانی کی ترسیل کر سکتے ہیں۔ سامع یا قاری انھیں ایسے ہی قبول کرتا ہے جیسے مقرر یا مصنف کی منشا تھی۔ یوں یہ تصور کیا گیا کہ لفظ اور معنی میں داخلی تسلسل موجود ہے۔ یوں تکلم کی موجودگی کو تحریر کی موجودگی پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ موجودگی سے دریدا کی مراد مطلق معنیاتی بنیاد (Absolute Foundation) ہے جس پر کسی بھی تصور کو قائم کیا جاتا ہے۔ اس مطلق معنیاتی بنیاد کو دریدا "مرکز" سے منسوب

کرتا ہے۔ دریدا نے افلاطون سے لے کر ہسرل تک کے فلسفیانہ بیانات کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ وہ جملہ فکری کوششیں جو مابعد الطبعیات کو معنی کی مستحکم بنیاد دینے کی سعی کرتی ہیں، سب خیالی اور غیر حقیقی ہیں۔ اگرچہ صوت مرکزیت پر مبنی مفروضات ضروری ہیں، لیکن جب تکلم کیا جاتا ہے تو 'تحریر' کی موجودگی بولنے والے کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

گفتگو میں بولنے والے کی 'موجودگی(Presence)' معنی اور اس کی صداقت کو برقرار رکھتی ہے۔ تحریر اس موجودگی سے محروم ہوتی ہے، اس بنیاد پر معنی کی صداقت کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ دریدا نے اس درجہ بندی کو متشدد قرار دے کر کہا کہ اس درجہ بندی کو معکوس تو نہیں کیا جا سکتا مگر اسے Differance کے عمل سے بے دخل ضرور کیا جا سکتا ہے۔ دریدا معنی کے لیے جس موجودگی (مرکز) کو موضوعِ بحث بناتا ہے وہ سوسئیر کے اس تصور سے اخذ کی گئی ہے کہ معنی نما اور تصورِ معنی اپنی پہچان اس افتراق سے حاصل کرتے ہیں جو زبان کے نظام میں ان کا دوسرے معنی نما اور تصور معنی میں ہوتا ہے۔ یوں لفظ اور معنی کے انفرادی عناصر منفی رشتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے رشتوں کو موجود نہیں کہا جا سکتا۔ دریدا کے خیال میں یہ غیر موجود بھی نہیں ہیں کیوں کہ جن کے افتراق سے اس کا انفراد قائم ہوتا ہے، معنی ان جملہ عناصر سے اپنے Traces دکھاتا ہے۔ یوں دریدا کے نزدیک متعین معنی کا موجود ہونا ناممکن ہے، جو کچھ موجود ہے وہ محض معنی کا اثر ہے۔ دریدا Traces کو مکمل غیر موجودگی خیال نہیں کرتا اور نشان کی موجودگی کو حتمی تسلیم کرتا ہے۔ موجودگی اور غیر موجودگی باہم مل کر معنی خیزی کے عمل کو ممکن بناتی ہیں۔ اس لیے لسانی نظام میں نہ کوئی عنصر حاضر ہے اور نہ کوئی غائب ہے۔ اس لیے تقریر و تحریر سے جو معنی قائم ہوتے ہیں، وہ حاضر اور غائب نشانات کے باہم مل کر عمل آرا ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ حاضر اور غائب کے غیر مستحکم رشتے کو دریدا ضمیمے (Supplement) سے منسوب کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حاضر غائب کا ضمیمہ ہے اور غائب حاضر کا۔ اپنی کتاب "Of Grammatology" میں وہ روسو کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ روسو نے تحریر کو تقریر کا سپلیمنٹ کہا تھا کہ تقریر میں تھوڑا بہت غیر اصل ضرور ہوتا ہے۔ دریدا کہتا ہے کہ تحریر نہ صرف معنی میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے بلکہ تقریر کی جگہ بھی لے لیتی ہے، کیوں کہ تقریر پہلے سے مرقوم ہے۔ اس حوالے سے اس کا یہ جملہ خاصا معروف ہے۔ "Speech is Always already written" دریدا یہ خیال کرتا ہے کہ تحریر نہ صرف یہ کہ تقریر میں اضافے کا کام کرتی ہے بلکہ تقریر کی جگہ بھی لے لیتی ہے، کیوں کہ تقریر ہمیشہ پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔ جملہ انسانی سرگرمیوں میں یہ اضافیت شامل ہوتی ہے۔ دریدا Signature Event

Context میں تحریر کو تین خصوصیات فراہم کرتا ہے جس کا ذکر رامن سیلڈن نے اپنی کتاب "نظریہ ادب میں راہنما اصول" میں یوں کیا ہے:

> "ا۔ تحریری علامت ایک نشان ہے جسے نہ صرف ایسے موضوع فاعل کی عدم موجودگی میں دہرایا جا سکتا ہے جس نے اسے ایک مخصوص سیاق و سباق میں چھوڑ دیا بلکہ ایک مخصوص مکتب الیہ کی عدم موجودگی میں میں بھی ۲۔ تحریری علامت اپنے "حقیقی سیاق و سباق" کو توڑ سکتی ہے اور اس امر سے قطع نظر کہ لکھاری کا مدعا کیا تھا اسے ایک مختلف سیاق و سباق میں پڑھا جا سکتا ہے۔ علامتوں کے کسی بھی سلسلے کو ایک متن کے ساتھ کسی اور سیاق و سباق میں پیوستہ کیا جا سکتا ہے۔ ۳۔ تحریری علامت دو معنوں میں "وقفہ دینے" سے مشروط ہے: ایک تو یہ کہ یہ ایک مخصوص سلسلے میں دوسری علامات سے علاحدہ ہوتی جاتی ہے؛ دوسرے یہ کہ یہ ''موجود حوالے" سے الگ ہوتی ہے (یعنی یہ صرف اس چیز کا حوالہ ہو سکتی ہے جو دراصل اس میں موجود نہیں ہے)۔ یہ خصوصیات تحریر کو تقریر سے ممتاز کرتی نظر آتی ہیں"(۴)

تحریر ایک خاص طرز کی بے نیازی کی حامل بھی ہوتی ہے کہ کیوں کہ اگر علامات سیاق و سباق سے ہٹ کر دہرائی جا سکتی ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کا اختیار کیا ہو سکتا ہے۔ دریدا تحریر و تقریر کی درجہ بندی کو ڈی کنسٹرکٹ کرتا ہے اور تقریر کو تحریر کی ایک شکل بتاتا ہے۔

متن کے مطالعے میں ردِ تشکیل غائب اور حاضر معنی میں غائب معنی کو زیادہ فعال خیال کرتی ہے۔ اس لیے قرأت کے تفاعل میں غائب معنی تک رسائی کو زیادہ اہم خیال کیا جاتا ہے مگر غائب معنی تک رسائی اسے حاضر معنی میں تبدیل کر دیتی ہے اس طرح پھر نئے غائب معنی تک رسائی لازمی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک نہ ختم ہونے والا تفاعلِ قرأت متن کی تقدیر بن جاتا ہے۔ یوں اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی متن حتمی اور واحد معنی کا حامل نہیں ہوتا۔ متن کے معنی مسلسل ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔ ہم متن کے ایک معنی تک پہنچتے ہیں تو اس کی تہہ میں مخفی مزید معنی روشن ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور جب ان تک رسائی ہوتی ہے تو مزید معنی کی تہہ ابھر آتی ہے۔ افتراق اور التوا کا یہ لا متناہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مزید یہ کہ افتراق اور التوا کا یہ سلسلہ متن میں باہر سے وارد نہیں ہوتا بلکہ یہ متن کی ساخت میں موجود ہوتا ہے۔ قاری کا کام اسے دریافت کرنا ہے۔ افتراق والتواء کے اس تصور کے بارے میں دریدا کا کہنا ہے:

"Differance is structure and a movement which

can not be conceived on the basis of opposition/presences/absence. Difference is the systematic play of differences, of traces, of differances, of the spacing by which elements refer to an other position"(۵)

دریدا کے نزدیک معنی کو کہیں قرار نہیں ہے۔ ایک معنی جب موجود ہوتا ہے تو دوسرا غائب ہوتا ہے، مگر غائب معنی موجود معنی میں اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے اور موجود معنی کی موجودگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ ردِ تشکیل کے تصور میں غائب کو موجود کا درجہ حاصل ہے، یعنی غائب معنی او جھل ہو کر بھی فعالیت کا احساس دلاتا ہے۔ اسی تصور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ژاک دریدا اپنی کتاب Of Grammatalogy میں متن کو از سرِ نو دیکھنے کی شعوری کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اور تمام طریقوں کی ردِ تشکیل کرتا ہے جن سے اس کی تعریف کی گئی تھی۔ وہ زبان میں مابعد الطبعیات کو عمل آرا دیکھتا ہے۔ مابعد الطبعیات سے اس کی مراد مرکز کا تصور ہے جس کو اس نے ہیگل کے مطالعے کے دوران میں اپنی کتاب Glas میں واضح کیا ہے۔

ساختیات پر تنقید کرتے ہوئے اس کا کہنا ہے کہ ساخت کا تصور اس بنیاد پر قائم ہے کہ معنی کسی نہ کسی مرکز کا حامل ہے۔ یہ مرکز ساخت کو اپنے تحت رکھتا ہے۔ وہ مرکز جو ساخت کو اپنے تحت رکھتا ہے، اسے تجزیے میں نہیں لایا جا سکتا۔ ساخت کے مرکز کو نشان زد کرنے کا مطلب ایک اور مرکز کو سامنے لانا ہو گا، جس کی دریدا نفی کرتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ غور کیا جائے تو فلسفے کی بنیاد ہی ایسے فلسفے پر استوار ہوتی ہے جو معنی کو مرکز مہیا کرنے کے اصول پر قائم ہیں، مثلاً خدا، انسان، وجود، وحدت، حق، شعور اور جوہر وغیرہ۔ دریدا کا خیال ہے کہ یہ اصطلاحات معنی کے جس مرکز پر استوار ہیں وہ ان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصورات قائم بالذات نہیں ہیں تو اس کا مطلب ہو گا کہ یہ قائم بالغیر ہیں۔ اگر قائم بالغیر ہیں تو اس کا مطلب ہو گا مرکز غیر میں ہے جیسا کہ نہیں ہے۔

غور کریں تو دریدا کے Difference کی حیثیت Objectified نہیں ہے بلکہ Quasi-trancendental ہے۔ دریدا صرف معنی کا امکان پیدا کرتا ہے اور پھر اس کے عدم امکان کو سامنے لاتا ہے۔ دریدا کے اس تصور کو مآخذ سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسا کرنا ایک طرح کے مرکز سے عبارت ہے۔ دریدا کے ردِ تشکیلی تصور میں مآخذ کے ساتھ ایک اور مآخذ ہے۔ اگر ماضی کی جانب رخ کریں تو اس کا سلسلہ لا متناہی ہے اگر

مستقبل کی جانب رخ کریں تو ماضی کے عوامل بھی اس میں اس حوالے سے شامل ہیں کہ وہ خود کو کسی سے تعلق میں نہیں لاتا کہ معنی کی مرکزیت قائم ہو سکے۔ یہ وحدت الوجودی حقیقتِ اولیٰ سے بھی مختلف ہے۔ یہ اس لیے مختلف ہے کہ وحدت الوجودی حقیقتِ اولیٰ حالتِ سکوت میں ہے جب کہ دریدا کے نزدیک حالتِ سکوت موجودگی کا دوسرا نام ہے، جو ممکن نہیں ہے۔اس حوالے سے بحث کرتے ہوئے عمران شاہد بھنڈر کا خیال ہے کہ :

> "دریدا معنی کی تلاش میں ہیگل کی The Science of Logic کے سب سے بنیادی تھیم، 'افتراق و تخالف' کی بنیاد پر معنی خیزی کے عمل کو مستعار لیتا ہے، جو اس کے مضمون Voilence and Mataphysics سے واضح ہے کہ کس طرح دریدا ہیگلیائی جدلیات کے اندر رہ کر اپنا نکتہ پیش کرتا ہے۔"(۲)

سوسئیر کے لسانی نظریے میں بھی ہیگل کی طرح کے تخالف و افتراق کا تصور موجود ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سوسئیر نے بھی اپنے نظریات ہیگل کے اس تصور سے کشید کیے ہیں۔ سوسئیر کے جس تصور سے دریدا بہت زیادہ متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ زبان ایک آزاد نظام ہے، جس میں معنی تخالف و افتراق اور خود مختار ہونے کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مابعد جدید مفکرین میں دریدا ایک ایسا فلسفی ہے جو ہیگل کے فلسفے سے متصادم ہے لیکن اپنی تمام کاوشوں کے باوجود وہ خود کو ہیگل کے فلسفے سے بچا نہیں پایا۔اسے اس بات کا ادراک ہے کہ ہیگل کے فلسفے سے باہر رہ کر اس کی مخالفت کرنے کا مطلب ہیگل کے فلسفے میں خود کو گم کر لینے کے مترادف ہو گا۔اسی لیے اس نے لیویناس کی نٹشی تشریح کو قابلِ تعریف نہیں سمجھتا۔

کسی بھی متن کا ردِ تشکیلی مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا متن میں موجود اپوریا سے سامنا ہوتا ہے۔اپوریا (Aporia) یوں تو یونانی اصطلاح ہے جس کا لفظی مطلب تعطل ہے لیکن پال دی مان نے اسے ژاک دریدا کے فلسفیانہ طریقہ کار کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے۔ ردِ تشکیل کی تھیوری میں اسے تعطل اور تشکیک کے مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے۔اپوریا کی وضاحت کرتے ہوئے ناصر عباس نیر تحریر کرتے ہیں:

> "اس سے مراد کسی متن کی وہ حالت لی گئی ہے جس میں گرفتار ہو کر متن تعطل، عدم تعین اور ایک قسم کی کشمکش کی زد میں آ جاتا ہے۔ یہ کش مکش دراصل متن کی منطق اور خطابت میں ہوتی ہے، متن کی منطق کچھ کہتی ہے مگر خطابت کچھ اور ظاہر کرتی ہے۔ سادہ ترین لفظوں میں کسی متن کے اسلوب اور مواد میں ہم آہنگی نہیں دوئی ہوتی ہے یا سگنی فائر اور سگنی فائیڈ میں یکجائی نہیں، ثنویت ہوتی ہے یا لفظ اور معنی میں اتحاد نہیں جدائی ہوتی

ہے۔ دریدا کی تھیوری سے واضح ہوتا ہے کہ اے پوریا کسی مطالعاتی حربے سے پیدا نہیں
ہوتا یہ متن کا وقوعہ (Occurance) ہے اور متن کی اپنی صورتِ حال ہے۔" **(۷)**

اے پوریا کی صورتِ حال اس وقت جنم لیتی ہے جب متن کچھ اور ظاہر کرتا ہے اور معنی خیزی کے عمل سے کچھ اور معنی بر آمد ہوتے ہیں۔ بقول کرسٹو فر نورس متن کی قرأت میں جب متن خطابت اور منطق کے مابین تناؤ کو سامنے لاتا ہے تو اس وقت یہ لمحے خود تردیدی کے ہوتے ہیں۔ خطابت اور منطق دو ایسی متصادم قوتیں ہیں جو معنی خیزی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ متن میں ایک قوت دوسری قوت کو بے دخل کر رہی ہوتی ہے، لیکن ذہن میں رہے کہ ایک قوت دوسری کو بے دخل کرتی ہے ختم نہیں کرتی۔ یوں متن میں اے پوریا سامنے آتا ہے اور تناؤ بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ سارا سلسلہ ایک کھیل (Play) ہے جو متن میں مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔

ردِ تشکیل اپنے رویے کے اعتبار سے پس ساختیاتی اس لیے تصور کی جاتی ہے کہ ساخت کو اس کے پہلے سے دیے گئے مقررہ معنوں میں قبول کرنے سے انکاری ہے۔ ردِ تشکیل اس ساختیاتی مفروضے پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے کہ معنی کی ساختیں ذہنِ انسانی کی داخلی ساخت سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں دریدا نے سوسئیر اور کلاڈ لیوی سٹراس کے تجزیے کیے ہیں۔ ان تجزیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان مفکرین کو کلی طور پر رد نہیں کرتا لیکن ان میں داخلی طور پر جو معنیاتی تضادات ہیں اس کو دریدا مرتکز مطالعے سے سامنے لے کر آتا ہے۔ دریدا کے مطابق متن کی قرأت کے دوران میں معنی کے تمام امکانات موجود رہنا ضروری ہیں۔ وہ اسی لیے ہسرل کا قائل ہے کہ اس کی تحریر زیادہ سے زیادہ معنوی امکانات کی حامل ہوتی ہے۔ پال دی مان ہو یا جے ہلز ملر اے پوریا کے اسی لیے قائل ہیں کہ بحث میں اس مقام پر پہنچ کر معنی کی جملہ جہات کھل جاتی ہیں اور مزید دلائل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ردِ تشکیل کے تصور نے ساختیاتی ناقدین پر یہ بات واضح کی ہے کہ منطق اور دلائل پر ان کا یقین درست نہیں ہے، کیوں کہ جس بنیاد پر انھوں نے یہ تصور قائم کیا ہے وہ خود بھی تشکیک کے دائرے میں آ سکتا ہے۔ ساختیات 'دوئی' کے جس تصور کو بنیاد بنا کر آگے بڑھی تھی، ردِ تشکیل نے اسے شک کی نذر کر دیا۔ اس نے تو متخالف عناصر کے کردار کو ہی کو بدل دیا۔ ردِ تشکیل ساختیات کے بنیادی تصورات پر شک کا اظہار کرتی ہے مگر اس کا مقصد ان تصورات کا رد کرنا نہیں ہے بلکہ ان جہتوں کو سامنے لانا ہے جو منطق اور بھاری دلائل کے نیچے دب گئی تھیں۔ دریدا نے اس اس طریق کا تجزیہ کیا ہے کہ جس کے ذریعے خود تخلیق کا متن اس منطق کو جھٹلاتا ہے جس پر اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ ردِ تشکیل میں جب متن کو Deconstruct کیا جاتا ہے تو وہ منہدم نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر کے تضادات کو طشت از بام کیا

جاتا ہے اور ان اجزا کی نشان دہی کی جاتی ہے جو متن کی تشکیل میں کار فرما تھے لیکن نظروں سے او جھل تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے مذہبی سطح پر بھی اس تصور کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے وہ اپنی کتاب "تنقید اور جدید اردو تنقید" میں تحریر کرتے ہیں:

> "مذاہب میں قیامت کا تصورDeconstructکے عمل ہی کی گواہی دیتا ہے۔زرتشت والوں نے کہا تھا کہ دنیا آگ سے تباہ ہو گی اور پھر اس کی راکھ سے ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔قیامت کا یہ تصور تمام مذاہب میں ملتا ہے۔اس سلسلے میں سب سے زرخیز تصور صورِ اسرافیل کا ہے جو ساخت شکنی کے نظریے کی بہترین ترجمانی کرتا ہے،یعنی یہ کہ صورِ اسرافیل کی آواز دوبارہ آئے گی،پہلی بار دنیا کو Deconstruct کرنے کے لیے،دوسری بار اسے اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم دینے کے لیے،یہی ساخت شکنی والوں کا مؤقف بھی ہے کیوں کہ ان کے ہاں تنقید کا عمل تخلیق کے سابقہ جہاں میں مضمر تضادات کو متحرک کر کے اسے توڑتا ہے،مگر ساتھ ہی اسے نئی روشنی میں بھی لا کھڑا کرتا ہے۔"(۸)

اسی طرح ردِ تشکیل کو وزیر آغا نے تصوف کے مطالعے میں بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ تصوف کا بنیادی مؤقف یہ ہے کہ پہلے توڑا جائے اور پھر اسے ایک بلند سطح پر جوڑا جائے۔ہماری روزمرہ کی زندگی رشتوں سے صورت پذیر ہوتی ہے،انسان ان رشتوں کو دائمی تصور کرتا ہے،مگر تصوف اس خیال کو ڈی کنسٹرکٹ کرتا ہے۔وہ وجود اور عدم کی ثنویت کو معکوس کر دیتا ہے۔عام انسان جن اشیاء کا حواسِ خمسہ کے ذریعے ادراک کر لیتا ہے اس کو وہ حقیقی سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے حواسِ خمسہ کی پہنچ سے باہر ہے وہ عدم ہے۔تصوف اس کی نفی کرتا ہے اور دلیل ظاہر کرتا ہے کہ حواسِ خمسہ کی گرفت میں آئی ہوئی دنیا جو کثرت کی مظہر ہے وقت کے تسلسل کی زد میں ہے اور ہمہ وقت تغیر پذیر ہے۔یہ نظر کا فریب ہے،حقیقی کائنات تو اس دنیا سے ماورا نہ ختم ہونے والی ایک "وحدت" ہے،جو مطلق ہے اور ناقابلِ تغیر پذیر ہے۔شاہد عمران بھنڈر نے یہاں وحدت کے مطلق ہونے پر سوال اٹھایا ہے کہ اس کا مطلق ہونا موجودگی کی دلیل ہے اور موجودگی کا مطلب مرکز کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے،جو ردِ تشکیل کی فکر میں ممکن نہیں۔

ردِ تشکیل شدید نوعیت کا بُت شکن رویہ ہے جو ساخت کے جملہ اجزا کو الگ الگ کر دیتی ہے۔یہاں دریدا کے نظریات کا تطابق مذہبی روایات سے کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔اگر لفظ ہر چیز کی ابتدا ہے تو اسلام میں اس کا تصور "کن

فیکون" میں موجود ہے۔ محی الدین ابنِ عربی کا قول ہے کہ "اللہ معنی ہے۔۔۔۔رب العالمین معنی کا سمندر ہے۔"ہندوستانی روایات میں اسی خیال کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ لفظ "اوم" سرشٹی کی تخلیق کا مبدا ہے۔اپنشدوں میں شبد کو "برہما" کہا گیا ہے۔انجیل میں لفظ "لوگس" تمام کائنات کی تشکیل کا سرچشمہ ہے۔دریدا کو انجیل میں خدا کے لفظ سے اختلاف ہے۔اس کا خیال ہے کہ لفظ "خدا" بولے جانے والا لفظ ہے جو ایک زندہ جسم سے ادا ہوتا ہے۔اس سے وہ یہ نکتہ اخذ کرتا ہے کہ تحریر پر تقریر کی فوقیت لفظ مرکزیت کی کلاسیکی صورت ہے۔بولا گیا لفظ اصل خیال سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔دریدا نے معنی وردِ معنی کو وہ سمت عطا کی کہ جہاں "لفظ مرکزیت" سے چھٹکارا پانا ممکن ہوا۔یہ کہا جا سکتا ہے ردِ تشکیل کا منظر نامہ فارم اور معنی کی وحدت کا نہیں بلکہ معنی کی ردِ وحدت کا ہے۔

دریدا اس بات کو بھی ردِ تشکیل میں بحث کا موضوع بناتا ہے کہ انسانی ذہن کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لفظ کے بغیر سوچ سکے۔دریدا سے پہلے یہ تصور ساختیات میں موجود تھا کہ حقیقت معروضی نہیں ہے۔جسے ہم حقیقت سمجھتے ہیں وہ زبان کے اندر تعمیر کی گئی ہے اور زبان سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔زبان چیزوں اور خیالات کو اپنے انداز میں بیان کرتی ہے اور چیزوں کے ساتھ اپنے طور پر مختلف اور متنوع تصورات وابستہ کر لیتی ہے۔اس تصور کے اثرات علوم کے تمام شعبوں پر مرتب ہوئے۔خاص طور پر ادب میں اس کے اثرات کو واضح دیکھا جا سکتا ہے۔یہ خیال کیا جانے لگا کہ ادب جو کسی نہ کسی زبان میں تحریر کیا گیا ہوتا ہے وہ کسی معروضی حقیقت کا نمایندہ نہیں ہوتا وہ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے جس کو اس زبان نے پیدا کیا ہوتا ہے۔سوسئیر کے تصورات کے مطابق زبان سے باہر چیزیں اپنا وجود تو رکھتی ہیں لیکن ان چیزوں سے وابستہ تصورات جن کو ہم حقیقت کہتے ہیں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔حقیقت کا کوئی معروضی وجود نہیں بلکہ ہم ان تصورات کو حقیقت کا نام دیتے ہیں جو زبان نے مختلف چیزوں کے ساتھ وابستہ کر رکھے ہیں۔ہم اپنے معروض میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا ادراک اس تناظر میں کرتے ہیں جو زبان نے ہمارے ذہنوں میں پختہ کر دیا ہے۔اسی طرح فرانسیسی مفکر لوئی التوزے سوسئیر کے لانگ اور پیرول کے تصور کا سماج پر اطلاق کرتا ہے کہ ہر معاشرے کے افراد کی فکر، رہن سہن، مذہبی اور سیاسی سوچ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔یہ طرزِ فکر سماج میں لانگ کی طرح کار فرما ہوتا ہے اور کسی فردِ واحد کی اس پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ہر سماج میں خاص طرزِ فکر زبان کے نظام کے اندر تشکیل پذیر ہوتی ہے اور جب کوئی فرد وہ زبان سیکھتا ہے تو لاشعوری طور پر اس طرزِ فکر کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔اب تمام عمر یہ اس کے لیے ایک حقیقت کا درجہ اختیار کر جاتی ہے اور وہ دنیا کو اسی تناظر میں دیکھنے کی عادت ڈال لیتا ہے۔یہ فرد اب جو کچھ سوچتا ہے اس کو معاشرتی پیرول کہا جا سکتا ہے۔وہ یہی تصور کرتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سوچ رہا ہے لیکن وہ

معاشرے کی لینگ کا پابند ہوتا ہے اور کبھی بھی اس لینگ سے باہر جا کر نہیں سوچ سکتا۔

مذکورہ تصور کو بنیاد بنا کر کہا گیا کہ جب فرد زبان اور اس کے اندازِ فکر سے باہر نہیں جا سکتا تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کی تحریر اس کے شعور کی عکاس ہوتی ہے۔ مصنف بھی معاشرے کے جملہ افراد کی طرح مخصوص اندازِ فکر کی پیداوار ہوتا ہے اور جب وہ کچھ تخلیق کرتا ہے تو وہ اسی اندازِ فکر کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ذات کسی آزاد شے کا نام نہیں ہے۔

دریدا نے مذکورہ تصورات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ زبان مخصوص اندازِ فکر کے ذریعے حقیقت کو سامنے لاتی ہے لیکن اس میں کلی طور پر کامیاب نہیں ہو پاتی۔ کہیں نہ کہیں اس میں کمی بیشی رہ جاتی ہے، جہاں یہ اپنے ہی بنائے ہوئے تصورات کو Contradict کرتی دکھائی دیتی ہے۔ دریدا کا خیال ہے کہ کوئی بھی فلسفیانہ نظام جب صورت پذیر ہوتا ہے تو وہ ایک مرکز تصور کرتا ہے اور اپنی نظریاتی بنیاد اس مرکز پر استوار کرتا ہے۔ مثلاً مذہب کی تمام نظریاتی بنیاد تصورِ خدا پر استوار ہے، یعنی مذہب کے تصورات کا مرکز خدا ہے۔ سائنس میں یہ مرکز عقل ہے۔ ادبی تنقید میں مصنف کی ذات کو مرکز تصور کر کے فن پارے کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے۔ مرکز کا یہ تصور نظام کے اندر موجود تمام عناصر کو ان کی جگہ پر قائم رکھتا ہے اور انھیں مرکز سے دور نہیں جانے دیتا۔ جب ادبی تنقید یہ تصور کر لیتی ہے کہ مصنف کی ذات ادب پارے کا مرکز ہے تو وہ فن پارے کو اس کی ذات کے حوالے سے پرکھنا شروع کر دیتی ہے۔ دریدا کا کہنا ہے کہ مرکز کا تصور کسی بھی تحریر کو محدود بنا دیتا ہے۔ تحریر کے متعدد رخ اور جہات ہوتی ہیں جو اس وقت سامنے آتی ہیں جب تحریر کے مرکز کو بے دخل کیا جاتا ہے۔ مرکز یا مصنف کی ذات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم کسی فن پارے کی تشریح کرتے ہیں تو محض ایک پہلو سامنے رہتا ہے اور دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دریدا کی ردِ تشکیل تحریر کو پڑھنے کا طریقہ کار ہے، یہ طریقہ کار پہلے کسی تحریر کا 'مرکز' تلاش کرتا ہے جس کے گرد اس پوری تحریر کا ڈھانچہ استوار ہوتا ہے۔ مرکز کی تلاش کے بعد اس کی بے دخلی کا مرحلہ آتا ہے۔ مرکز کو بے دخل کرنے سے دیکھا جاتا ہے کہ اب تحریر کا کیا رنگ سامنے آتا ہے۔ ردِ تشکیل نئے مراکز کی تلاش کا نام نہیں ہے بلکہ مرکز کی بے دخلی سے جو معنی کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں اس کا نام ہے۔

اردو ادب میں ردِ تشکیل کے مباحث کا آغاز ۱۹۸۰ء کی دہائی سے شروع ہوا۔ اس حوالے سے جو اہم نام سامنے آئے ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نظام صدیقی، وزیر آغا، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شارب ردولوی، شمس الرحمان فاروقی، قمر جمیل ، جمیل جالبی، احمد ہمیش ، دیوندر اسر، فہیم اعظمی، ناصر عباس نیر، شمیم حنفی، قاضی افضال

حسین، ابو الکلام قاسمی، حامد کاشمیری، رؤف نیازی، مناظر عاشق ہر گانوی، عتیق اللہ اور ڈاکٹر اقبال آفاقی کے نام نمایاں ہیں۔ اردو تنقید میں مابعد جدید مباحث میں گوپی چند نارنگ کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس نے ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کے حوالے سے خاصا کام کیا اور ردِ تشکیل پر بھی متعدد مضامین قلم بند کیے۔ مشرقی تنقید میں ردِ تشکیل کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے رفعت اختر تحریر کرتے ہیں:

> "اگر ہم دسویں اور گیارہویں کے عرب علمائے شعر مثلاً عبدالقادر جرجانی، شمس قیس رازی، ابنِ رشیق، باقلانی، ابنِ خلدون وغیرہ کی تحریروں میں دیکھیں تو کلر، رولاں بارتھ اور دریدا کے اقوال کی مماثلت نظر آتی ہے۔ سارے مفکر صوت مرکزیت اور نطق مرکزیت میں یقین رکھتے ہیں لیکن دریدا کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس نے شعوری طور پر اس نظریہ کو ادبی دنیا سے روشناس کروایا۔" **(۹)**

مابعد جدیدیت اور پس ساختیاتی تصورات کی ترویج میں ہندوستانی رسائل "معیار" اور "شاعر" نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں ہیں۔ جب کہ پاکستان میں "اوراق" اور "صریر" نے ان مباحث کے حوالے سے اشاعت کا کام کیا۔ ردِ تشکیل کا تعلق مابعد جدید مباحث سے ہے، جن کا آغاز انگریزی تنقید کی نسبت اردو میں بہت بعد میں ہوا۔ نظام صدیقی نے اس حوالے سے اپنے مضامین میں کھل کر بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی کے مابعد جدید تناظر میں معاصر اردو شعری اور افسانوی ادب اور خاص طور پر مابعد جدید تنقید، اپنی مخصوص شعریات کی تخلیق کر رہی ہے جو جامد اور ساکن کردار کی حامل نہیں ہے، بلکہ زندہ نامیاتی اور متحرک کردار کی امین مابعد جدید نئی جمالیات اور نئی اقدار سامنے لا رہی ہے جس کی بنیاد ردِ تشکیل کے نظریہ پر استوار کی گئی ہے۔ **(۱۰)**

اردو کے معروف نقاد عتیق اللہ نے بھی اپنے ایک مضمون "مابعد جدید تصورِ نقد: ردِ تشکیل" میں دریدا کے تصورات پر روشنی ڈالی ہے۔ اعتیق اللہ نے اپنے مضمون میں اس بات کا خیال ظاہر کیا ہے کہ متن کے بشکل ہی وہ معنی قرار پا سکتے ہیں جو بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ معنی کی متلون صورت ہی سطح کی تہہ یعنی متن کی ساخت میں اترنے کی بھی محرک ہوتی ہے۔ ردِ تشکیل اس عمومی عقیدے کا بھی رد کرتی ہے کہ متن مصنف کے اس معنی پر مشتمل ہوتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں تھا یا جس کا اظہار اسے مطلوب تھا۔ اس معنی کا انکشاف ممکنات میں سے ہے اور ہر تفہیم کسی نئے معنی کو مقرر کرنے اور گزشتہ کو رد کرنے سے عبارت ہے۔ ردِ تشکیل کی تھیوری کے مطابق معنی ایسی چیز نہیں ہے جسے متن کے اندر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ردِ تشکیل نے پہلی بار قاری کے آزادانہ تفہیم کے حق کو تسلیم کیا ہے اور بہ اصرار تسلیم

کرانے کی کوشش کی ہے اور تمام آزادیوں کو بحال کیا ہے جو قاری کو بلاتحفظ معنی آزمائی کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ ردِ تشکیل معنی ہی نہیں سچائی کو بھی نشان زد کرتی ہے کہ مکمل تفہیم محض ایک بھرم ہے کیوں کہ ہر قاری اپنے طور پر معنی اخذ کرتا ہے۔(۱۱)

ڈاکٹر وزیر آغا، ناصر عباس نیر اور اردو کے دیگر ناقدین نے ردِ تشکیل کو صرف اُصولِ قرأت ہی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ معانی کا فلسفہ بھی قرار دیا ہے۔ رد تشکیلی طریقہ کار متن کے معنی کی نہ صرف وحدت کو پارہ پارہ کرتا ہے، بلکہ وحدت کے ساتھ ساتھ مطلق، حتمی، اٹل اور مقدس تصورات جو حرفِ آخر مانے جاتے ہیں ان پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے اور اس کی جگہ کثرت کے تصور کو ابھارتی ہے جو صرف ایک کھیل ہے۔ تنقید سے ہر شخص کسی نہ کسی واضح فیصلے یا قطعیت کی توقع رکھتا ہے لیکن ردِ تشکیل کی تھیوری قاری کو معنی کے بے کراں سمند میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کا یہ رویہ جبر و اقتدار کی قوتوں کو بے نقاب کرتا ہے اور حتمیت، قطعیت اور مطلقیت کا خاتمہ کر کے سوال کرنے کے حق کا تحفظ کرتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ گوپی چند نارنگ، "ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات"، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰،ص۲۰۴

۲۔ R. Gnanasekaran, "An Introduction to Derrida", Deconstruction and Post Structuralism, included: Academic Research Journal, Vol.3, July2015, p212

۳۔ ناصر عباس نیر،"جدید اور مابعد جدید تنقید(مغربی و مشرقی تناظر میں)"،کراچی:انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص۲۱۲

۴۔ رومن سیلڈن ، "نظریۂ ادب کے راہنما اُصول"،مترجم:اعزاز باقر،اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص۹۹

۵۔ Jacques Derrida, of Grammatology, London, The John Hopkins University Press,1976, p23

۶۔ شاہد عمران بھنڈر،"فلسفہ مابعد جدیدت: تنقیدی مطالعہ "، گوجرانوالہ: ہاذہ اکیڈمی، سن ندارد، ص۲۶

۷۔ ناصر عباس نیر،"مابعد جدیدیت کی اہم اصطلاحات"، مشمولہ: ادبی تھیوری: ایک مطالعہ، مرتب: قاسم یعقوب، فیصل آباد: شمع بکس، ۲۰۱۴ء، ص۱۷۴

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،"تنقید اور جدید اردو تنقید"، کراچی: انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۴ء، ص۸۱

۹۔ رفعت اختر،"اردو تنقید پر عالمی اثرات"، لکھنو: اُترپردیش اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۵ء، ص۱۱۱

۱۰۔ http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=59313.

۱۱۔ ندیم احمد ،ڈاکٹر،(مرتب)"ترقی پسندی،جدیدیت، مابعد جدیدیت"،دہلی:بھارت آفسیٹ ،۲۰۰۳ء، ص۴۶۳تا ۴۷۵